زہر و تریاق
سید قاسم جلال

فہرست

☆☆☆☆

عصرِ حاضر کا منفرد شاعر

کچھ عرصہ پہلے قاسم جلال کا صرف نام ہی سنا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ پچھلے دنوں اس سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ اس کے فن اور شخصیت کا تعارف بھی ہوا۔ قاسم جلال سے ملاقات نے میرے علم میں اس خوشگوار حیرت کا اضافہ کیا کہ نئے شاعروں میں کم از کم ایک شاعر ایسا موجود ہے، جس کے ہاں ادراک واحساس کا توازن اور فن وبصیرت کا تناسب موجود ہے۔

قاسم جلال کے قاری کو اس سے یہ شکایت نہیں ہوسکتی کہ اس کے کلام میں علم اور مطالعے کی چاشنی شامل نہیں ہے یا اسے فن پر قابو نہیں۔ ورنہ ہمارے شعراء میں یہ رجحان عام ہے کہ وہ اپنی کوتاہیٔ فن اور سہل انگاری کو تجربہ، فکری انتشار کو وسیع المشربی اور عجزِ بیان کو گھٹن سے تعبیر کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ قاسم جلال کے ہاں اس نوعیت کا احساسِ تفاخر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اظہار وابلاغ میں ایک اعتماد اور لہجے میں توانائی موجود ہے۔ یہی چیز اسے دیگر شعراء میں ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ قاسم جلال کے طرزِ فکر میں بصیرت اور طرزِ احساس میں جذبے کی ایک آنچ ملتی ہے۔

اس کے ہاں حقیقت نگاری کا ایک ایسا اسلوب نظر آتا ہے جس میں صداقت اور جذبے کا اخلاص شامل ہے۔ یہ اسلوبِ خاص تفکر اور تدبر کو مہمیز دیتا ہے۔ قاسم جلال نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح ادھوری حقیقتوں اور سچائیوں کا متلاشی نہیں بلکہ سچ کا پیامبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچ بہرحال ایک مکمل اور ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس کے نقاد حقیقت بیانی

میں کہیں لہجے کی تلخ کامی محسوس کریں لیکن اس کی شفاف نیتی کے بارے میں دو آراء نہیں ہوسکتیں۔ قاسم جلال کا فن ہمہ جہت ہے۔ اس کی ادبی کاوشیں نظم ونثر کے رنگا رنگ پھولوں سے مزیّن ہیں۔ شاعری میں اس نے غزل، نظم، نعت اور دیگر اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح نثر میں افسانہ، ڈرامہ اور ترجمہ نگاری میں اپنے جوہر کا اظہار کیا ہے۔ اس کی تحریر میں تنوع اور تازگی ہے۔ وہ فکروفن کی پختگی اور اسلوب کی حسن کاری کو ملحوظ رکھتا ہے۔

عہدِ حاضر کی دانش کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ جرأتِ اظہار سے محروم ہے۔ نظم ہو یا نثر جدید دانشور چبا چبا کر بات کرنے کو کمالِ ہنر سمجھتے ہیں۔ قاسم جلال کی دانش ہر نوع کی عصری منافقتوں اور اظہار کے بحرانوں سے یکسر مبرّا ہے۔ قاسم جلال کے فن کی عمارت حقیقت پسندی، خیال افروزی، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور احترامِ آدمیت کے ستونوں پر استوار ہے۔ جس پر وہ اپنے خونِ جگر سے مینا کاری کرتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ فکر اور تخلیقی عمل میں رشتہ قائم کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں بڑے بڑے شاعروں کا پتہ پانی ہوجاتا ہے۔ قاسم جلال بڑی مہارت کے ساتھ افکار کو احساس کی آنچ دے کر پیکرِ شعر میں ڈھالتا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے قاسم جلال واضح اور روشن نصب العین کا شاعر ہے۔ ہمارے بیشتر شاعر اور فنکار نظریاتی نقطۂ نظر سے ایک ''روشِ خاص'' پر نازاں رہتے ہیں اور نیم پخت اجنبی تصورات کو متاعِ لوح وقلم بنا کر پیش کرنا ہنر کا کمال سمجھتے ہیں۔

قاسم جلال کے شعری تجربے کی اساس، اعلیٰ اقدارِ حیات، ملّی احساس اور قومی شعور ہے۔ اس کا وجدان انسانیت کے بلند اوصاف اور

اولوالعزمی سے توانائی پاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں شعروادب کے ایوانوں میں ایک نئی اور سچی آواز سننے کو ملی ہے۔ آیئے اس آواز کے کچھ لہجے ہم بھی سنیں۔

ابھی تو قرض چکانا ہے ان کو مٹی کا
یہ بات کیوں مری دھرتی کے لال بھول گئے

....

کس کا آئینۂ افکار میں ہے عکس جمیل؟
دل کے آنگن میں یہ کس چاند کی تنویریں ہیں؟

....

جسمِ بے روح شاعری ہے وہ
ہو نہ جس کی حقیقتوں پہ اساس

....

دشتِ افکار کا مسافر ہوں
منزلوں کا چراغ ہے خامہ

کائنات میں زندگی کا ظہور سب سے بڑی قدر ہے۔ زندگی کے ہزار رنگ ہیں۔ ہر رنگ اپنے اندر فکرونظر کے بے پایاں سامان رکھتا ہے۔ انسان کا وجود جملہ مظاہرِ حیات میں سب سے ارفع مقام کا حامل ہے۔ انسان وہ ہستی ہے جس میں خالق نے اپنی صفات کے خاص اجزاء ودیعت کر دیئے۔ یوں انسان کائنات کا سب سے خوبصورت نمونۂ تخلیق ہے اور شاعری حیاتِ انسانی کا سب سے حسین وصف ہے۔ شاعری میں مظاہرِ ہستی تخلیقی رنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے شاعری اقدارِ حیات کا سب سے حسین مرقع ہے۔ ''زہروتریاق'' قاسم جلال کا شعری مجموعہ ہے۔ فضائے آسماں میں تازہ انجم کا طلوع وغروب ہوتا رہتا ہے۔ افقِ ادب پر قاسم جلال

اپنے مدار کا وہ سیارہ ہے جس کی آواز، گردش اور تابانی روز افزوں ہے اور یہ سیارہ بے شمار سیارگانِ شعروسخن میں اپنی الگ پہچان کرانے لگا ہے۔ اس کا شعری وجدان مسلسل سفر کے بعد اب ایک ایسے موڑ پر آ پہنچا ہے جہاں سے شعورو آگہی اور جذبہ واحساس کی نئی راہیں نکلتی ہیں۔

مجھے یہ کہنے دیجئے کہ لمحۂ موجود میں اردو شاعری کا عمومی مزاج مدھم پڑ گیا ہے۔ شاعری کے تیور اب پہلے سے نہیں رہے۔ پون صدی پیشتر اقبال شاعری میں خیال ونظر کی بجلیاں پیس کر سمو رہے تھے۔ دوسری طرف ترقی پسند شعراء مادّی جدیدیت کو شعری تجربے میں ڈھال رہے تھے۔ بعد میں جدیدیت کے آہنگ میں آزاد فکر کے حامل شعراء بالکل نئے امکانات کے شعر کہنے لگے، تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بیسویں صدی کے غروبِ آفتاب کے وقت اردو شاعری لہجے، آہنگ اور خیال کے تازہ آفتاب لے کر آئے گی۔ مگر اب اکیسویں صدی کا آغاز ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ شعراء نئے احساس، نئی آگہی اور نئے تجربے سے آنکھ ملانے کی تاب نہیں رکھتے۔ ہر طرف برف کی دکانیں ہیں۔ کہیں شعلہ نہیں اور کوئی شرر نہیں۔

افقِ شعر پر چند دہائیاں پیشتر طلوع ہونے والا سیارہ، قاسم جلال مسلسل سفر اور ریاضت کے بعد لہجے اور فکر کی انفرادیت پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ جس طرح انیسویں صدی کے اختتام پر حالی نے نایاب مال کی دکان سب سے الگ کھولی تھی اسی طرح بیسویں صدی کے اواخر میں کم سے کم ایک شاعر تو ایسا اُبھرا جسے عہدِ حاضر کی ظلمتوں کا احساس تھا اور جس نے برف کے بازار میں شعلوں کی دکاں کھولنے کا اعلان کیا۔ جس کے لب پر نئے سورج کی کرنوں کا پیام ہے۔

شاہراہوں کی طرف رستے نکلتے ہیں جہاں
سوچ کو اس انقلابی موڑ پر لایا ہوں میں
ہے مرے لب پر نئے سورج کی کرنوں کا پیام
وادیٔ ظلمت میں مانندِ سحر آیا ہوں میں

میں سمجھتا ہوں کہ فکری یبوست اور فنی جمود کے اس عہد میں قاسم جلال ہی ایک ایسا شاعر ہے جسے فکرونظر کے نئے آسمان کی تلاش ہے۔ وہ جدید شعراء کی طرح ابہام اور لایعنیت کے شاہکار تخلیق نہیں کرتا اور نہ ہی روایت کی جامد تقلید میں شعری صلاحیتیں صرف کرتا ہے۔ اسے آشوبِ آگہی کا عارضہ لاحق ہے نہ وہ ذات کے کرب واذّیت کے اظہار میں جذباتی ونفسیاتی تسکین کے سامان ڈھونڈتا ہے اور نہ ہی نئی نسل کے ناراض نمائندے کی مانند اس کے ہاں...... الجھاؤ ہے زمین سے جھگڑا ہے آسمان سے...... کا منفی رویہ ملتا ہے۔

غرض قاسم جلال کے شعری رویوں میں بہت سے نئے مسافرانِ سخت کی سی رسم ورہِ عام کی پابستگی بھی نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ کا مرکز ومحور اوّل وآخر انسانیت کا احترام، خلوص ومحبت اور رجائیت ہی رہتا ہے۔ وہ ماحول کے کرب پر دل برداشتہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ترقی پسندوں کے شعری فارمولے کی روایت پر چلتے ہوئے، جبر، استحصال، سماجی اور طبقاتی ناانصافی کے موضوعات کی جگالی کرتا ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے شکار ہونے پر اس کا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے لیکن وہ کسی سیاسی مینیفسٹو یا نام نہاد انسان دوستی کے اِدّعا کے ساتھ بات نہیں کرتا بلکہ حسن، خیر اور صداقت کی اقدار کا متلاشی رہتا ہے اور حیات کی باقی رہنے والی صفات کی پاسداری کرتا ہے۔ وہ فرسودہ افکار اور ژولیدہ تصورات کی زنجیریں توڑ کر ذہنِ انساں کو

سچائی اور انصاف کا خوگر دیکھنا چاہتا ہے۔

توڑ کر ظلم و جور کی زنجیر
لشکرِ حق کو نیک نام کریں
ہر تعصّب مٹا کے سینے سے
آؤ انساں کا احترام کریں

دل کا فرماں ہے کہ ماحول سے کٹ کر سوچیں
مصلحت کہتی ہے جذبات سے ہٹ کر سوچیں
دور لے جائیں نہ منزل سے، یہ اندھے جذبے
آؤ اک بار، پھر اک بار، پلٹ کر سوچیں

....

ان کو تحقیق کی میزاں میں نہ جب تک تولیں
ہم سے تقلیدِ رسومات نہیں ہو سکتی

....

قاسم جلال کی شاعری میں فکر کا عنصر، اسے دوسرے بے شمار شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے دور کے شعراء اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حقائق کو فکر و تدبر کی نظر سے دیکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور ان میں ذات کے خول سے باہر آنے کی سکت نہیں۔ وہ اپنی نیم وا آنکھوں سے باہر کی دنیا کو دیکھتے بھی ہیں لیکن پھر نئے مادّی اکتشافات کی چکا چوند میں گم ہو کر ذات کے حصار میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قاسم جلال جس عہدِ گزراں میں سانس لے رہا ہے اس کے عصری تقاضوں سے غافل نہیں۔ اس کی نظر کشادہ اور مشاہدہ وسیع ہے۔ وہ عصری میلانات کو مخصوص فکری اور جذباتی حوالوں سے نہیں دیکھتا بلکہ مشاہدے کو تخلیقی تجربے کی بھٹی

سے گزار کر بصیرت اور آگہی کے نئے باب وا کرتا ہے۔

سلگتے ہیں شجر، بارود کی بو ہے ہواؤں میں
پرندے گھٹ کے مر جائیں نہ زہریلی فضاؤں میں

....

چھوڑ اے دل! فرار کے حیلے
بن کے سقراط زہرِ غم پی لے
عہد نامہ ابھی نہ کر منسوخ
ہیں ابھی تو حروف بھی گیلے

....

موجودہ دور میں غزل کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے روایتی موضوعات اور پامال شعری آہنگ سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ غالب نے غزل کے پیکر کو بقدرِ ظرف نہ پا کر بھی اسی تنگنائے میں فکر و نظر کی وسعتیں سمو دی تھیں۔ آج کے غزل گو شاعر کو بھی نئے حوالوں کے آہنگ میں بات کرنا ہوگی۔ ورنہ غزل بطور صنفِ شعر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گی۔

غزل پر اس بُرے وقت میں قاسم جلال ہی وہ واحد شاعر ہے جو فکر و احساس کے نئے امکانات اور نئے لہجے میں شعر کہہ رہا ہے۔ اس کی غزل تنوع اور جدّت سے آشنا نظر آتی ہے۔

پروفیسر حفیظ الرحمٰن خاں

''زہروتریاق'' اُردوغزل کے ارتقاء کی روشن مثال

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال کا نام شاعری میں ہی نہیں بلکہ تحقیق وتنقید میں بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ پاکستان کے ادب کی Main stream میں شامل ہیں اور یہ سب ان کی تحقیقی لگن اور تخلیقی انہماک کا نتیجہ ہے۔

''زہروتریاق'' سیّد قاسم جلال کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ انہیں زبان و بیان پر قابلِ رشک حد تک دسترس حاصل ہے اور ان کا کلام ایک عرصے سے رسائل وجرائد اور مجموعوں کی صورت میں قارئین کی نظر سے گزرتا رہا ہے۔ ''زہروتریاق'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے۔

قاسم جلال کی غزل گردوپیش کے حقائق اور داخلی کیفیات کے حسین امتزاج کی آئینہ دار ہی نہیں اُردوغزل کے ارتقاء کی روشن مثال بھی ہے۔

ان کی غزلوں کے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آدمی کو روز وشب دیتے ہیں آئینے فریب
اصل چہرہ تو کسی نے آج تک دیکھا نہیں

....

تھا خوف بُجھنے کا لیکن دیا جلانا تھا
ہوا کا ظرف ابھی اور آزمانا تھا

....

اس کے وعدوں پہ ہے یقیں مجھ کو
عمر شاید مری وفا نہ کرے

اگر ہو ممکن تو جو چمن پر ہوئے ہیں نازل عذاب لکھنا
اور اپنے خوں میں قلم ڈبو کر نئی رُتوں کا نصاب لکھنا

....

مندرجہ بالا آخری شعر ہر سچے تخلیق کار کی طرح قاسم جلال کا بھی منشور ہے۔ میری دُعا ہے کہ وہ اس پر استقامت سے عمل کرتے ہوئے فکر وفن کا حق ادا کرتے رہیں۔

محسنؔ بھوپالی

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال ـــ راستی و راست روی کا پیامی

سیّد قاسم جلال کا مجموعۂ کلام ''زہر و تریاق'' اُن کے زرخیز احساس اور پُر جوش قوتِ اظہار کا آئینہ دار ہے۔ اس میں شامل سادہ، سہل اور دل آویز اسلوب کی حامل غزلیں، اخلاص کی شیرینی اور ہنروری کی رعنائی سے عبارت ہیں۔

جلال کا کلام دین و عرفاں اور فقر و درویشی کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ حق و صداقت سے وابستگی، نفاق و ریا سے بیزاری اور خود شناسی ان کی فکر کے درخشاں زاویے ہیں۔ ان کی وسعتِ ظرف ــ تعصّبات اور اختلافات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ وہ راستی اور راست روی کے پیامی ہیں۔ وہ تنگ نظری اور عدمِ مساوات کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کے ظاہر و باطن میں حائل خلیج پاٹ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا روّیہ مثبت اور رجائیت سے معمور ہے۔

قاسم جلال نے ذات پر ارتکازِ توجہ کے ساتھ ساتھ مشاہدۂ گرد و پیش بھی کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عصری مسائل بھرپور انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔ وہ وادیٔ علم و تحقیق کے ریاضت کش سالک ہیں اور انہوں نے مشرقی علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ ان کے افکار کی پختگی اور الفاظ و تراکیب کی برجستگی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے علمی و ادبی ذوق نے فارسی اور اُردو کی کلاسیکی شعری روایات سے کسبِ فیض بھی کیا ہے اور ان کی شایانِ شان پاسداری بھی کی ہے۔ جلالؔ کی غزلوں میں جدتِ فکر بھی ہے اور تازگیٔ اسلوب بھی۔

غزلوں کی بحریں طویل ہوں یا مختصر، انہیں ابلاغِ افکار پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ خصوصاً ان کی چھوٹی بحروں کی غزلیں بلیغ تر ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی (شعبۂ فارسی)، یونیورسٹی اورئینٹل کالج۔ لاہور

حمد

شبِ غم کا اثر دل سے مٹاتی ہے تری خوشبو
فسانے صبحِ تازہ کے سناتی ہے تری خوشبو

گھٹاؤں کی زبانی تیرے پیغامات ملتے ہیں
نسیمِ صبح گاہی لے کے آتی ہے تری خوشبو

گلابِ بے خزاں! تو گرچہ نظروں سے ہے پوشیدہ
مگر ہر دم تری صورت دکھاتی ہے تری خوشبو

بھٹک جائے مسافر جب کوئی تو خضرِ رہ بن کر
قریبِ منزلِ مقصود لاتی ہے تری خوشبو

زہے قسمت کہ نزدیکِ رگِ جاں ہے تری ہستی
مرے ہر سانس کے ہمراہ آتی ہے تری خوشبو

جلالِ زار کا جب حبسِ غم سے سانس رکتا ہے
اچانک صحنِ دل میں مسکراتی ہے تری خوشبو

نعت

عشق نبیؐ بسا ہے اس طرح جان و تن میں
جیسے چراغ کوئی روشن ہو انجمن میں

تیری ہی ذات سے ہیں سوچیں مری درخشاں
تجھ سے جلا ہے میرے آئینۂ سخن میں

عاشق درود ایسے روضے پہ پڑھ رہے ہیں
ہوں عندلیب جیسے نغمہ سرا چمن میں

فرمانِ مصطفیؐ ہے حکمِ خدا کا مظہر
انوارِ حق ہیں ماہ یثرب کی ہر کرن میں

اک بار جا کے دیکھوں میں روضۂ مقدّس
مدّت سے یا الٰہی! یہ آرزو ہے من میں

ہو لفظ لفظ تارا ہو حرف حرف جگنو
عکسِ جمال تیرا اُترے جو میرے فن میں

یوں دل میں بس رہی ہے یادِ شہِ مدینہؐ
خوشبو ہو جیسے گُل میں، جاں جس طرح بدن میں

لگتا ہے یوں مدینے میں اے جلاؔل آ کر
آ جائے کوئی جیسے پردیس سے وطن میں

وہ سخن ور جو کھری سوچ کا قائل نہ ہوا
فن کے معیار کی جانب کبھی مائل نہ ہوا

جس کو حاصل ہوا ایقانِ عطائے یزداں
زندگی بھر وہ درِ غیر کا سائل نہ ہوا

قلبِ رہرو میں نہ پیدا ہوئی منزل کی تڑپ
جب تلک سنگ کوئی راہ میں حائل نہ ہوا

حیف صد حیف کہ فرسودہ روایات کا زہر
ذہنِ انساں سے کسی دور میں زائل نہ ہوا

ہاں وہ کج فہم سمجھتا ہے زبانِ شمشیر
کارگر اس پہ کبھی زورِ دلائل نہ ہوا

کیا اسے منزلِ مقصود کی ہو قدر جلالؔ
وہ مسافر جو رہِ شوق میں گھائل نہ ہوا

فریاد اگر یوں دلِ ناشاد کرے گا
کچھ اور نئے جور وہ ایجاد کرے گا

اے دوست! اگر شکوۂ بیداد کرے گا
کچھ اور چھری تیز وہ جلّاد کرے گا

بلبل! تجھے آزاد تو صیّاد کرے گا
لیکن تجھے پر کاٹ کے آزاد کرے گا

اب جس کے جرائم تو چھپاتا ہے بصد شوق
اک دن یہی ساتھی تجھے برباد کرے گا

اب جس کے مصائب کے ترے لب پہ ہیں شکوے
اک روز اسی وقت کو تو یاد کرے گا

اے دوست! نہ پڑھ اس کی سخاوت کے قصیدے
بدلے کی توقع ہو تو امداد کرے گا

کب اس دلِ مضطر کو سکوں دے گا خدایا
کب گلشنِ برباد کو آباد کرے گا

○

○

چارہ سازِ مرگ نے غم کا مداوا کر دیا
روح کی بیتابیوں کا بوجھ ہلکا کر دیا

پھر دلِ ناداں نے اظہارِ تمنا کر دیا
اپنی غیرت، اپنی خودداری کو رسوا کر دیا

وہ چمن ہوں جس کو گلچینوں نے صحرا کر دیا
وہ کنواں ہوں میں جسے ڈولوں نے گدلا کر دیا

ایک وہ جو ظلمتوں میں محوِ نظارہ رہے
ایک وہ ہیں روشنی نے جن کو اندھا کر دیا

ہائے وہ پتّے بگولوں کی شکایت کیا کریں
ٹہنیوں نے خود ہی جن کو بے سہارا کر دیا

لے گیا تحت الثریٰ سے کون سوئے کہکشاں
کس نے میری ذات سے مجھ کو شناسا کر دیا

حُسن نے بھڑکائی خود ہی آتشِ ذوقِ طلب
پھول نے بلبل کو بیتابِ تماشا کر دیا

کیا قیامت ہے رفیقو! شدتِ احساس بھی
قطرۂ موجِ بلا کو جس نے دریا کر دیا

آشنائے وسعت و رفعت ہوئی جب مشتِ خاک
ذرّے ذرّے نے جہاں میں حشر برپا کر دیا

ارتقاء وجہِ زوالِ روحِ انساں ہو گیا
روشنی نے ظلمتوں کو اور گہرا کر دیا

ان کی ہمدردی سے پھر آنکھوں میں بھر آئے ہیں اشک
پھر شرارِ غم کو پھونکوں نے شرارا کر دیا

مائلِ پرواز جب دیکھا تو مشتِ خاک کو
آندھیوں نے گرد بادِ دشت پیما کر دیا

ضبطِ پیہم، ناخدائے کشتیِٔ دل ہے جلالؔ
جس نے گردابِ بلا کو بھی کنارا کر دیا

○

ان سے جب عرضِ مُدعا ہو گا
دل میں اک حشر سا بپا ہو گا

چشمِ قاتل سے اشک جاری ہیں
اس سے کیا بڑھ کے خوں بہا ہو گا

کیوں ہے پُرداغِ سینۂ لالہ
آبِ شبنم سے جل گیا ہو گا

راہبر سے نہ رکھ امید کہ اب
شوقِ منزل ہی رہنما ہو گا

سوچ کیوں مبتلائے کرب ہوئی؟
اب ہمیں یہ بھی سوچنا ہو گا

کس لیے اشک بار ہے شبنم
باغ میں کوئی گُل کھلا ہو گا

تم بتاؤ کہ تم پہ کیا گزری
وہ تو جاں سے گزر گیا ہو گا

اے جلالؔ اس کا اب تصور بھی
صورتِ آہِ نارسا ہو گا

○

○

دوستوں کے سرد لہجوں نے نہ جانے کیا کہا
رہ گیا دم توڑ کر ہونٹوں پہ حرفِ مُدّعا

میں خوشی سے اس کو رخصت کر کے آیا تھا مگر
میرے اندر کون تھا جو رات بھر روتا رہا

ڈھل گئی ہے ایک حشرِ جاوداں میں زندگی
ہر نفس دُہرا رہا ہے داستانِ کربلا

آبلہ پائی کا بخشا کتنے کانٹوں کو خراج
ذات کی پُرپیچ راہوں کا سفر کیسا رہا؟

خوب ہے تیری سخاوت کی اداکاری مگر
میرے لب پر بھی ہے پیشہ ور بھکاری کی دُعا

شبنمی لہجے میں روشن ہیں الاؤ کس لیے
کاش نکتہ چیں مِری مجبوریاں بھی دیکھتا

کاش وہ الفاظ بھی مل جائیں مجھ کو اے جلالؔ
بے زباں جذبات کو کر دیں جو گویائی عطا

○

اگر ہو ممکن تو جو چمن پر ہوئے ہیں نازل عذاب لکھنا
اور اپنے خوں میں قلم ڈبو کر نئی رُتوں کا نصاب لکھنا

سکوتِ دریا پکارتا ہے ہواؤ! اب آؤ تو خدارا
خموش موجوں کے ہر ورق پر صحیفۂ انقلاب لکھنا

اسی لیے نفرتوں کا ہر دور میں نشانہ بنے رہے ہیں
ہمیں نہ آیا سیاہئ شب کو جلوۂ آفتاب لکھنا

کہیں یہ القاب پیار کے راستے کی دیوار بن نہ جائیں
نہیں ہے اچھا خطوں میں اپنوں کو یوں حضور و جناب لکھنا

کسی کی خوبی کو اپنی ذاتی مخالفت پر کرو نہ قرباں
جو صورتِ خار دل میں کھٹکے اسی کو رشکِ گلاب لکھنا

اجی یہ یک طرف عشق چھوڑو، ہے عزتِ نفس بھی کوئی شے
اگر ہے خط اس کا سرسری سا تو تم بھی رسمی جواب لکھنا

ضمیر خوابیدہ جاگ اٹھا ہے، یا فقط ہے زمانہ سازی
اب ان کی سوچوں میں کس طرح آ گیا ہے یہ انقلاب لکھنا

ہم اہلِ دل ہیں، ہمارا مسلک ہے زخم کھا کر دعائیں دینا
ہوئی ہے تذلیل جس کے ہاتھوں اسی کو عزت مآب لکھنا

کرو نہ اپنوں سے یوں تغافل، ہمارے خط کا جواب تو دو
تمہاری مرضی ہے اس میں بے شک شکایتیں بے حساب لکھنا

ابھی تو اِس کارواں کو درپیش منزلِ مرگ کا سفر ہے
ابھی کتابِ حیات کا ہے جلالؔ اک اور باب لکھنا

تھا خوف بجھنے کا لیکن دیا جلانا تھا
ہوا کا ظرف ابھی اور آزمانا تھا

یہ کیا کہ غیر نے کی تجھ پہ آ کے سنگ زنی
خود اپنے ہاتھ سے اپنا لہو بہانا تھا

ابھی سے تیز ہواؤں میں اُڑ گئے تنکے
ابھی تو ہم نے نیا آشیاں بنانا تھا

ہزار شکر کہ چہروں سے اُٹھ گئے ہیں نقاب
عقیدتوں نے نیا گُل کوئی کھلانا تھا

سماعتوں پہ لگے قفل توڑتے پہلے
فسانۂ دلِ بیتاب گر سنانا تھا

ملے ہیں یوں کہ کبھی جس طرح ملے ہی نہ تھے
وہ لوگ جن سے تعلق بہت پرانا تھا

وفا کو پاؤں کی زنجیر کیوں بنایا تھا
جو تجھ کو بھول گیا، اس کو بھول جانا تھا

جلال تلخ حقیقت نے کھول دیں آنکھیں
اگرچہ خواب کا منظر بڑا سہانا تھا

○

بہار آئی تو قرارِ قلب و جاں چلا گیا
کشاں کشاں میں سوئے دشت بے اماں چلا گیا

اگرچہ سب مریضِ غم کے غمگسار تھے مگر
ہر اک سنا کے اپنی داستاں چلا گیا

نہ جُوئے دوستی سے جس کو ایک بوند مل سکی
خلوص و مہر کا وہ بحرِ بے کراں چلا گیا

وہ ایک لمحۂ وصال کس قدر عجیب تھا
جو چھوڑ کر دلوں پہ نقشِ جاوداں چلا گیا

ہے کون جس سے آج کھُل کے دل کی بات کہہ سکوں
وہ ہم نفس، وہ ہم سخن وہ ہم زباں چلا گیا

نگاہِ شوق مضطرب تھی جس کے انتظار میں
اڑا کے خاکِ اہلِ دل وہ کارواں چلا گیا

نظر سے گر کے اعتبارِ ذات ہو گیا فنا
نشیبِ ارض میں فرازِ آسماں چلا گیا

عقیدتوں کو منزلِ مراد کی تلاش تھی
جبیں جھکی تو اور دور آستاں چلا گیا

جلاؔل جس کے دم سے ہر سماں بہشتِ دید تھا
وہ نازِ باغباں و فخرِ گلستاں چلا گیا

○

○

گو ساتھ ساتھ راہ کا ہر پیچ و خم گیا
چلتے رہے جہاں ترا نقشِ قدم گیا

جھوٹی انا کے خول میں وہ اب بھی بند ہے
رسّی تو جل گئی مگر اس کا نہ خم گیا

ان سے تعلّقات کی تجدید کیا ہوئی
پہلی رفاقتوں کا بھی اب تو بھرم گیا

یاروں نے فن کو مالِ تجارت بنا دیا
جب سے خیالِ حُرمت اہلِ قلم گیا

میں تو فنا ہوا ہوں، اجالوں کی خیر ہو
تارا یہ بات کہتا ہوا صبح دم گیا

صد شکر وہ بچھڑ کے ہمیں مل گئے مگر
پہلی شبِ جدائی کا دل سے نہ غم گیا

اب کیوں نہ اختلاف کی باتیں کریں حریف
اپنا ہی یار کھول وفا کا بھرم گیا

جب تک جیے جہاں میں رہی حسرتِ سکوں
آئی خوشی نہ راس، نہ دل سے الم گیا

پیاسی زمیں کے ہونٹ نہ تر ہو سکے جلالؔ
برسے بغیر آج بھی ابرِ کرم گیا

○

○

جو وفا آشنا نہیں ہوتا
آدمی کام کا نہیں ہوتا

کِھل اُٹھی ہے کلی کلی لیکن
پیڑ دل کا ہرا نہیں ہوتا

حال کیا اہلِ درد کا جانے
درد جس نے سہا نہیں ہوتا

ختم ہوتے نہیں کبھی جذبے
سازِ دل بے صدا نہیں ہوتا

جس کو انساں سے پیار ہوتا ہے
مر کے بھی وہ فنا نہیں ہوتا

ہم نے بھی لُٹ کے یہ سبق سیکھا
ہر کوئی رہنما نہیں ہوتا

گو وہ آنکھوں سے دور ہے لیکن
دل سے ہرگز جدا نہیں ہوتا

ہم کوئی سُکھ اُدھار کیسے لیں
قرضِ جاں ہی ادا نہیں ہوتا

آدمی اے جلالؔ جیتے جی
قیدِ غم سے رہا نہیں ہوتا

○

جو لوگ ڈال رہے ہیں محبتوں کی طرح
فضائے دہر میں پھیلیں گے خوشبوؤں کی طرح

کچھ اس طرح ہمیں احساس نے فریب دیا
ہر ایک واہمہ پایا، حقیقتوں کی طرح

فضا مرے چمنِ دل کی، آج تک ہے وہی
بدل رہا ہے مزاج اس کا، موسموں کی طرح

جو خواب ہم نے سجائے تھے اپنی آنکھوں میں
چھلک نہ جائیں کسی روز آنسوؤں کی طرح

ہر آدمی میں نہ ڈھونڈو خلوص کا امرت
ہر ایک پھول پہ بیٹھو نہ تتلیوں کی طرح

اجڑ نہ جائے کہیں گلستانِ عقل سلیم
محیطِ ذہن ہیں جذبات آندھیوں کی طرح

انا کے گنبدِ بے در سے جب سے نکلا ہوں
دکھائی دیتے ہیں حاسد بھی محسنوں کی طرح

یہ کیا کہ آج چُرانے لگا نظر مجھ سے
مکیں تھا دل میں جو اک شخص خواہشوں کی طرح

جلال اہلِ خرد کو ہے جستجو جس کی
بسا ہوا ہے دلوں میں وہ دھڑکنوں کی طرح

تجھ کو آخر کیا ملا؟ اے وقت! پیارے چھین کر
اب تو خوش ہے مجھ سے جیون کے سہارے چھین کر

ناامیدی! یوں نہ کر میری تمناؤں کا خوں
کیا ملے گا تجھ کو بچوں سے غبارے چھین کر

کس نے دی ہے شبنمی خوابوں کو شعلوں کی تپش؟
کس نے آنکھوں میں بھرے آنسو نظارے چھین کر

جس کی رہ تک تک کے گوری کی نظر پتھرا گئی
راکھ بھر دی مانگ میں اس نے، ستارے چھین کر

جس سے کچھ خیرات ملنے کی ہمیں امید تھی
لے گیا وہ شخص کاسے بھی ہمارے چھین کر

اور سب کچھ ہے مگر وہ لطفِ محرومی نہیں
اس نے مفلس کر دیا مجھ کو، خسارے چھین کر

بے نیازِ کیف و غم کس نے کیا ہے اے جلالؔ
لے گیا ہے کون؟ احساسات سارے چھین کر

○

لوحِ دل سے جب مٹے نفرت کے زہریلے حروف
لب پہ فوراً آئیں گے چاہت کے جوشیلے حروف

میں ہوں اُمّی اور عبارت بھی شکستہ خط میں ہے
کیا پڑھوں میں اُس کتابِ رخ کے شرمیلے حروف

قصۂ غم کے یقیناً منطقی انجام ہیں
صفحۂ رُخسار پر اشکوں کے یہ گیلے حروف

شعر تو موضوعِ چابک دست سے بنتا ہے شعر
ورنہ ہو جاتے ہیں سارے سست اور ڈھیلے حروف

ہے مزّین شبنمی لفظوں سے خاروں کا لغت
اور ہیں فرہنگِ گُل میں درج پتھریلے حروف

پیار کی افشاں چھڑک دے خط کی سطروں پر جلالؔ
تاکہ ہو جائیں سنہرے اور چمکیلے حروف

○

○

اپنی ذات کے اندر دیکھ
خود کو سب سے چھپ کر دیکھ

میری زخمی روح میں جھانک
منظر میں پس منظر دیکھ

بند لبوں کی چیخیں سن
حیراں آنکھ کا منظر دیکھ

سورج کی توہین نہ کر
اپنا موم کا پیکر دیکھ

کس کے خوں کے چھینٹے ہیں
آنکھیں کھول، افق پر دیکھ

ہم بھی آنکھ ذرا بدلیں
تو بھی راہ بدل کر دیکھ

جذبے بانجھ ہوئے ہیں کیوں
چہرے کیوں ہیں بنجر دیکھ

تیرا شوق بجا، لیکن
اڑنے سے پہلے، پر دیکھ

دستاریں بھی ڈھونڈ مگر
کیا اس قابل ہے سر، دیکھ

کچھ اپنی سوچوں کو پرکھ
کچھ ماحول کے تیور دیکھ

چہروں کی شادابی میں
روحوں کے ویراں گھر دیکھ

اب نہ جلال صدا دے گا
لاکھ اسے مڑ مڑ کر دیکھ

○

○

بہار آئی تو آنے لگا خزاں کا خیال
محیطِ کیف ہوا کربِ جانستاں کا خیال

یہ روح جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں ہے
ستائے رکھتا ہے بلبل کو آشیاں کا خیال

سبب تلاش کیا حل طلب مسائل کا
جو تیر کھائے تو آنے لگا کماں کا خیال

چُنا ہے قافلہ سالارِ زیست وہ کہ جسے
نہ فکرِ جادۂ منزل نہ کارواں کا خیال

فرازِ کوہ پہ ہے کاہ کی نگاہ لگی
جلاؔل قطرے کو ہے بحرِ بیکراں کا خیال

○

○

وہم ہستی ہے جی رہے ہیں ہم
خواب میں خواب دیکھتے ہیں ہم

قلبِ ناداں حریف عقل ہوا
گھر کے بھیدی سے لُٹ گئے ہیں ہم

جذبِ دل ہے کہ حسن کا افسوں
جب ہنسا چاند رو دیئے ہیں ہم

کیا ملائیں جلالؔ ان سے نظر
اپنی نظروں میں گر چکے ہیں

○

○

لائے ہیں پیغام کسی کا مست، نشیلے موسم
رنگ رنگیلے، چھیل چھبیلے اور سجیلے موسم

اب بجھتی سوچوں کے خالی کاسے بھر جائیں گے
کرنیں بانٹ رہے ہیں اندر کے چمکیلے موسم

پھر لہجوں میں تلخی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے
کانچ کی بستی میں پھر اُترے ہیں پتھریلے موسم

سوچ کی دھرتی سے ہوں دور اگر پتھر اور کانٹے
رنگ بکھیریں کومل جذبوں کے شرمیلے موسم

آہوں سے اکثر اندر کے طوفاں تھم جاتے ہیں
غم کی آگ بجھاتے ہیں اشکوں کے گیلے موسم

چاہت کے ان پھولوں کو اللہ سلامت رکھے
اب کے جوبن پر ہیں نفرت کے زہریلے موسم

وہ آجائیں تو لہرائیں رنگ جلالؔ فضا میں
وہ آجائیں تو پھر چھیڑیں گیت رسیلے موسم

وہ جن سے روز نئے زخم کھا رہے ہیں ہم
تعلقات انہی سے بڑھا رہے ہیں ہم

انائے خام کی دیوار ڈھا رہے ہیں ہم
خود اپنے قلزمِ خوں میں نہا رہے ہیں ہم

خود اپنی جاں پہ سدا دھوپ کا عذاب سہا
جہاں کے واسطے سائے لٹا رہے ہیں ہم

ہر ایک رَہ پہ لٹیروں سے لُٹ رہے ہیں مگر
ہر ایک راہ پہ شمعیں جلا رہے ہیں ہم

چُرا رہا ہے نظر جو بڑی مہارت سے
اُس اجنبی کے کبھی آشنا رہے ہیں ہم

وصال و ہجر کے عالم سے آشنا ہو کر
حیات و مرگ کے اسرار پا رہے ہیں ہم

ستم تو یہ ہے مسیحائی کر رہے ہیں جو
انہی کو زہر کے ساغر پلا رہے ہیں ہم

کچھ ان کے ظرف کا مقصود امتحاں بھی ہے
کچھ اپنا صبر جلالؔ آزما رہے ہیں ہم

ہاں خوشی کی تو وہ تھوڑی سی رمق دیتے ہیں
ہے یہ افسوس بصد درد و قلق دیتے ہیں

صبحِ نو! اُن سے گریزاں نہ ہو، اپنے خوں سے
جو ترے رُخ کو سدا رنگِ شفق دیتے ہیں

ہم ہیں اُس مدرسۂ فکر میں داخل کہ جہاں
زندگی بھر جو نہ بھولے وہ سبق دیتے ہیں

ہم وہ بیمار ہیں لکھ کر وہ جنہیں نسخے میں
قُرص توبہ کی، ندامت کا عرق دیتے ہیں

گریہ نیت ہے کہ اس پر نہیں قائم رہنا
حلف نامے کا ابھی پھاڑ ورق دیتے ہیں

چھیننا پڑتا ہے یہ قوتِ بازو سے جلالؔ
ورنہ غاصب کہاں مظلوم کو حق دیتے ہیں

واصل بحق ہوں اور جیے جا رہا ہوں میں
معصوم ہوں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

برسوں سے تیری بزم میں ظلمت فشاں تھے جو
گُل کر کے عشق کے وہ دیئے جا رہا ہوں میں

ممکن تھا یہ کہ ساتھ تجھے لے چلوں مگر
اے دوست! تیری یاد لیے جا رہا ہوں میں

عرفانِ ذاتِ حق کے لیے کائنات میں
کافر سہی جہاد کیے جا رہا ہوں میں

پھر جامِ ماہ ہے مرے ہاتھوں میں اے جلالؔ
پھر چاندنی کا زہر پیے جا رہا ہوں میں

دل میں منزل کی طلب، پاؤں میں زنجیریں ہیں
شبنمی خواب، دہکتی ہوئی تعبیریں ہیں

تلخیٔ غم کو تبسم میں چھپاؤں کب تک
میرے آنسو میرے جذبات کی تصویریں ہیں

کس کا آئینۂ افکار میں ہے عکسِ جمیل؟
دل کے آنگن میں یہ کس چاند کی تنویریں ہیں؟

دشت و کوہ و چمن و ابر و مہ و مہر و فلک
کاتبِ دفترِ آفاق کی تحریریں ہیں

گردِ آئینۂ دل ہے یہ نہیں موجۂ آہ
نہیں آنسو یہ گنہ گار کی تقصیریں ہیں

حیف صد حیف کہ عالم کو نہیں علم اپنا
گرچہ ہونٹوں پہ گرجتی ہوئی تقریریں ہیں

طالبِ معرفتِ حق کے لیے تحفۂ حق
دولتِ فقر ہے، افلاس کی جاگیریں ہیں

ایک ناسور کی صورت ہیں جرائم اپنے
مرہمِ آبلہ انگیز یہ تعزیریں ہیں

کیا سبب ہے کہ گل افشاں ہے جلالؔ اس کا سخن؟
اور لہجے سے برستی ہوئی شمشیریں ہیں

○

○

گُل بھی کہلاتے ہو اور واقفِ خوشبو بھی نہیں
کیسے مانجھی ہو جسے معرفتِ جُو بھی نہیں

کس لیے شعلۂ احساس کو بھڑکاتے ہو؟
اب تو رونے کے لیے آنکھ میں آنسو بھی نہیں

یہ بجا ہے کہ نیا ہے میرا اندازِ نظر
اب وہ پہلا سا ترے حُسن میں جادو بھی نہیں

میں جہاں ہوں وہاں سورج ہے سوا نیزے پر
صبحِ عارض بھی نہیں اور شبِ گیسو بھی نہیں

شکوۂ یار میں کیوں اتنا غُلو کرتے ہو
گو وہ خوش طبع نہیں اتنا تو بدخو بھی نہیں

حُسن بھی ہاتھ میں زنجیر لیے پھرتا ہے
اور صحرائے نظر میں رمِ آہو بھی نہیں

حُسن میں اور بھی مستور ہیں جلوے یہ فقط
سرخیٔ لب بھی نہیں ہے، خمِ ابرو بھی نہیں

بے اثر اس پہ اگر زورِ دلائل ہے جلالؔ
زینۂ فتح و ظفر قوتِ بازو بھی نہیں

سلگتے ہیں شجر، بارود کی بُو ہے ہواؤں میں
پرندے گھٹ کے مر جائیں نہ زہریلی فضاؤں میں

یہ خدشہ ہے کہیں دن کے اُجالے میں نہ لٹ جائے
چلا ہے کارواں جو آج شب تاروں کی چھاؤں میں

دُعا برسات کی، پیاسے پرندے کس طرح مانگیں؟
چھپے ہیں بجلیوں کے اژدھے، کالی گھٹاؤں میں

اگر میری طرح تم بھی اسی دَر کے سوالی ہو
تو اپنی بھی صدا شامل کرو میری صداؤں میں

تمہاری یاد لے کر جو جہاں سے ہو گیا رخصت
اسے بھی یاد کر لینا کبھی اپنی دُعاؤں میں

خدایا! کون چھپ کر سسکیاں بھرتا ہے، راتوں کو
ہوا سے تھرتھراتے، خشک پتوں کی صداؤں میں

بچھڑتے ہی میں اس کی یاد کے گرداب میں ڈوبا
رہا کرتے ہی اس نے ڈال دی زنجیر پاؤں میں

جلالؔ ان کے دلوں میں کاش کوئی جھانک کر دیکھے
نظر آتے ہیں جو لپٹے ہوئے رنگیں قباؤں میں

○

○

زمیں پہ شوق کے مارے کچھ اور کہتے ہیں
فلک پہ چاند ستارے کچھ اور کہتے ہیں

نہ ڈوب جائے کہیں آج کشتیِ تدبیر
کہ حادثات کے دھارے کچھ اور کہتے ہیں

چلو یہ مان لیا تو ستم شعار نہیں
مگر یہ لوگ تو پیارے کچھ اور کہتے ہیں

اگرچہ لفظ بھی ہیں ترجمانِ جذبۂ دل
تصورات ہمارے کچھ اور کہتے ہیں

نگارِ حسن لبِ بام کس طرح آئے؟
تری نظر کے اشارے کچھ اور کہتے ہیں

نہ چھیڑ ذکر ابھی بے قرار موجوں کا
کہ آبجو کے کنارے کچھ اور کہتے ہیں

یہاں مشاہدہ کیسے ہو اے جلاؔل جہاں
نظر کچھ اور، نظارے کچھ اور کہتے ہیں

○

○

اس کے جلووں میں کھو گئیں آنکھیں
قابلِ دید ہو گئیں آنکھیں

کس کی پلکوں پہ میرے آنسو ہیں؟
کس کا دامن بھگو گئیں آنکھیں

آنسوؤں نے مٹا دیئے سب داغ
دامنِ دل کو دھو گئیں آنکھیں

جب وہ آیا تو ہم ہوئے رخصت
بخت جاگا تو سو گئیں آنکھیں

لب تو کرتے رہے گُل افشانی
اور نشتر چبھو گئیں آنکھیں

کتنے چہرے بسے خیالوں میں
کتنے موتی پرو گئیں آنکھیں

کاٹ کر فصلِ اشک سوچتا ہوں
خواب کیوں دل میں بو گئیں آنکھیں

شوقِ دیدار بھی جلالؔ آخر
آنسوؤں میں ڈبو گئیں آنکھیں

خوبصورت سی بھول ہوتے ہیں
وعدے کاغذ کے پھول ہوتے ہیں

زندگی بھر جدا نہیں ہوتے
درد بھی بااصول ہوتے ہیں

جو خود اپنی نظر میں گر جائیں
کب کسی کو قبول ہوتے ہیں

چاہتوں کے چمن میں ہی اکثر
نفرتوں کے ببول ہوتے ہیں

اک زمانہ ہے جن کی ٹھوکر میں
تیرے قدموں کی دھول ہوتے ہیں

کوئی اپنا نہیں جلالؔ یہاں
چھوڑیئے کیوں ملول ہوتے ہیں

○

اب تو دل میں تری طلب بھی نہیں
گو بظاہر کوئی سبب بھی نہیں

جی رہے ہیں جو ہیں حیات سے سیر
پی رہے ہیں جو تشنہ لب بھی نہیں

نوحۂ غم بھی اب نہیں لب پر
اور کوئی نغمۂ طرب بھی نہیں

بے حجابی بھی مرگِ الفت ہے
شرطِ وابستگی ادب بھی نہیں

ظلمتِ غم میں چاند تارے کیا
مشعلِ آہِ نیم شب بھی نہیں

جو دعائیں جلالؔ ہوں بے روح
ہو نہ مقبول تو عجب بھی نہیں

○

○

ہوں قریبِ رگِ جاں اور نایابوں میں ملیں
اس ملاقات سے بہتر ہے کہ خوابوں میں ملیں

بے وفا! یوں تری آنکھوں میں ہے اخلاص کا رنگ
عکس دریاؤں کے جس طرح سرابوں میں ملیں

اپنے چہروں کا بھرم رکھنے کی خاطر اب تو
سب نے یہ سوچ لیا ہے کہ نقابوں میں ملیں

کیوں نہ ہم عالمِ اعراف میں خود کو سمجھیں
لمحے قربت کے جو فرقت کے عذابوں میں ملیں

سازو آواز کا سنگم ہی نہیں ہے کافی
قلبِ مطرب کی صدائیں بھی ربابوں میں ملیں

اے طلبگارِ وفا کر نہ فقیروں سے گریز
عین ممکن ہے کہ دریا بھی حبابوں میں ملیں

خوب پہچانتے ہیں اہلِ نظر ان کو جلاؔل
لاکھ پردوں میں چھپیں، لاکھ حجابوں میں ملیں

○

○

دل تڑپ رہا ہے کیوں راحتوں کے موسم میں
رنگ و نور کی رُت میں، نکہتوں کے موسم میں

جب غروب ہوں خوشیاں، ہم طلوع ہوتے ہیں
ہم سے لوگ ملتے ہیں ہجرتوں کے موسم میں

مصلحت پسندی نے دل سے ولولے چھینے
کاش ہم ملے ہوتے حسرتوں کے موسم میں

بے سکوں فضاؤں میں شادماں ہے دل میرا
یہ گلاب کھلتا ہے وحشتوں کے موسم میں

رُت جدائی کی آخر بیت ہی گئی لیکن
دُوریاں ہیں کیوں رقصاں قربتوں کے موسم میں

وہ چمن حقارت سے دیکھتا ہے کیوں ہم کو
جس کی پرورش کی تھی چاہتوں کے موسم میں

کس نے پھر پرندوں کے آشیاں جلا ڈالے
کربِ غم بھرا کس نے راحتوں کے موسم میں

اے جلالؔ یہ کس کے حُسن کا کرشمہ ہے
کھو گیا ہے آئینہ حیرتوں کے موسم میں

○

○

زخموں کے ساتھ ڈوب گیا جھیل میں بدن
اب قیدِ جاں سے ہوگا رہا جھیل میں بدن

یوں دھوپ کے عذاب نے گھیراؤ کر لیا
مرغابیوں کا جلنے لگا جھیل میں بدن

پانی کی آس کر گئی پرواز جاں کے ساتھ
بے روح تشنگی سے ہوا جھیل میں بدن

اہلِ نظر کی گرم نگاہی کا ہے اثر
سہلا رہا ہے چاند مِرا جھیل میں بدن

ہو ہو کے خاک اڑتی رہی ہے کنول کی روح
سیراب گرچہ ہوتا رہا جھیل میں بدن

کیسے میں اپنی ذات کے اجزا بہم کروں
صحرا میں روح آبلہ پا، جھیل میں بدن

انگڑائی لے کے جاگ اُٹھے جس طرح ضمیر
یوں چاند کا لرزنے لگا جھیل میں بدن

منڈلا رہی ہیں یاد کی مُرغابیاں جلالؔ
پھر آنسوؤں کا ڈھلنے لگا جھیل میں بدن

کہنے کو تو بات کہہ گیا ہوں
خود بن کے مذاق رہ گیا ہوں

ہے دُور گلاب دسترس سے
کانٹوں میں الجھ کے رہ گیا ہوں

مفہوم سے خود نہیں ہوں واقف
گو کام کی بات کہہ گیا ہوں

کل تک تھا تری نظر کا سرمہ
اب صورتِ اشک بہہ گیا ہوں

اب نعمتِ مرگ بھی عطا کر
جینے کا عذاب سہہ گیا ہوں

تلقینِ شعور کرتے کرتے
جذبات کی رو میں بہہ گیا ہوں

○

دل کا فرماں ہے کہ ماحول سے کٹ کر سوچیں
مصلحت کہتی ہے جذبات سے ہٹ کر سوچیں

دور لے جائیں نہ منزل سے یہ اندھے جذبے
آؤ اک بار پھر اک بار پلٹ کر سوچیں

کل تو سورج نہیں آئے گا سَوا نیزے پر
شام کو پوچھتی ہیں مجھ سے لپٹ کر، سوچیں

دل کا آئینہ کسی دَور میں دُھندلا نہ سکے
وقت کی دُھول میں، رہ جائیں نہ اَٹ کر سوچیں

جا کے قبروں کی مساوات کا منظر دیکھے
وہ جو کہتا ہے کہ طبقات میں بَٹ کر سوچیں

یاد آتے ہیں کبھی جب وہ سُلگتے جذبے
بین کرتی ہیں مِرے ساتھ لپٹ کر، سوچیں

میں نے تعبیر کے موضوع پہ جب غور کیا
لے گئیں خواب بھی آنکھوں سے، جھپٹ کر، سوچیں

دل میں ہر لمحہ قیامت کا سماں ہو تو جلالؔ
کیسے آئیں کسی مرکز پہ سمٹ کر، سوچیں

○

وہ اگر ہم خیال ہو جائیں
ختم سارے ملال ہو جائیں

وہ ہوں آمادۂ جواب اگر
ہم سراپا سوال ہو جائیں

شہر والوں کا ہے خدا حافظ
چور جب کوتوال ہو جائیں

ہے جدائی خدا کی اک نعمت
قربتیں جب وبال ہو جائیں

ہاتھ سے آس کا عصا نہ گرے
حوصلے جب نڈھال ہو جائیں

ہو اگر آپ کی نگاہِ کرم
بے ہنر، باکمال ہو جائیں

آؤ نکلیں انا کے خول سے اب
رابطے پھر بحال ہو جائیں

حوصلہ ہار دوں جلالؔ اگر
کام سارے محال ہو جائیں

چاہنا تھا جس طرح اس نے مجھے چاہا نہیں
ابر تو برسا ہے لیکن ٹوٹ کر برسا نہیں

اِس حقیقت کو دلِ ناداں کبھی سمجھا نہیں
ہم جسے اپنا سمجھتے ہیں وہی اپنا نہیں

جو محیطِ جان و دل تھا ابرِ غم، برسا نہیں
ایک آنسو بھی ہماری آنکھ سے ٹپکا نہیں

لوگ اچھے کو بھی اچھا کہہ نہیں سکتے یہاں
ہم بُرے کو گر برا کہہ دیں تو کیا اچھا نہیں

میں نے سردارِ قبیلہ سے کیا تھا اختلاف
اس لیے میری حمایت میں کوئی بولا نہیں

مصلحت کے تحت سب نے روپ بدلے ہیں یہاں
کوئی اندھا، کوئی گونگا اور کوئی بہرا نہیں

آدمی کو روز و شب دیتے ہیں آئینے فریب
اصل چہرہ تو کسی نے آج تک دیکھا نہیں

ہم خریدارِ زیاں ہیں، ہم نے جیتی ہے شکست
ان خساروں کے فوائد کوئی بھی سمجھا نہیں

اپنا حق مانگو یہ دستورِ زمانہ ہے جلالؔ
مطمئن سمجھا گیا وہ شخص جو چیخا نہیں

○

جس سفینے کا ناخدا ہی نہیں
اس کو ساحل کبھی ملا ہی نہیں

اک قیامت گزر گئی ہم پر
آپ کہتے ہیں کچھ ہُوا ہی نہیں

زندگی شعلۂ تپاں بھی ہے
زندگی موجۂ صبا ہی نہیں

ٹھہریئے آپ جا رہے ہیں کہاں
حالِ دل تو ابھی کہا ہی نہیں

مطلبِ اشک و آہ کیا سمجھے
آتشِ غم میں جو، جلا ہی نہیں

جس میں ہم سانس لے سکیں کُھل کر
اب وہ ماحول وہ فضا ہی نہیں

ہاں ہمیں کو تھا شوقِ بربادی
آپ کی تو کوئی خطا ہی نہیں

کس طرح ہو علاجِ کج فہمی
اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

سُن کے رودادِ غم وہ کہتے ہیں
پھر کہو میں نے کچھ سنا ہی نہیں

بچ کے رہنا جلاؔل یاروں سے
ہیں یہ ظالم بھی بے وفا ہی نہیں

○

○

تم کہاں ہو اے تمناؤ! ابھی زندہ ہوں میں
یوں نہ تنہا چھوڑ کر جاؤ ابھی زندہ ہوں میں

کیوں ہے آخر یہ مسلسل بے رخی، پیہم گریز
مجھ کو جیتے جی نہ دفناؤ ابھی زندہ ہوں میں

جاں نہ نکلی تن سے تو جلاد پر آئے گا حرف
پھر مجھے سُولی پہ لٹکاؤ ابھی زندہ ہوں میں

پوچھتی ہے عقل، سوچوں کو جلا بخشے گا کون؟
دل یہ کہتا ہے نہ گھبراؤ ابھی زندہ ہوں میں

کوئی حسرت دل میں رہ جائے نہ باقی دیکھنا
جس قدر چاہو ستم ڈھاؤ ابھی زندہ ہوں میں

موت کی تصدیق کرنے کی ہے کیا جلدی تمہیں
اے طبیبو! اے مسیحاؤ! ابھی زندہ ہوں میں

قدرِ اہلِ فن یہاں ہوتی ہے بعدِ مرگ ہی
لب پہ مت دادِ سخن لاؤ ابھی زندہ ہوں میں

کر رہے ہو کس لیے گوروکفن کا اہتمام؟
وارثو! فی الحال گھر جاؤ ابھی زندہ ہوں میں

موت آئے گی تو ہوگی ختم یہ دیوانگی
اور مجھ پر سنگ برساؤ ابھی زندہ ہوں میں

مرتے مرتے خوں بہا کا فیصلہ کر جاؤں گا
اے مرے قاتل! نہ گھبراؤ ابھی زندہ ہوں میں

ہے دلوں پر نقش بعدِ مرگ بھی فکرِ جلالؔ
اہلِ دنیا کو یہ سمجھاؤ ابھی زندہ ہوں میں

○

چہرہ بدلیں نہ آئینے بدلیں
اب نگاہوں کے زاویئے بدلیں

پھر ملاقات ہو نہ جائے کہیں
راستے احتیاط سے بدلیں

سامنے ہوں اگر نئے منظر
ہم بھی آنکھوں کے ذائقے بدلیں

روز تصویر اک بدلنے سے
ہے یہ بہتر کہ چوکھٹے بدلیں

ہر طرف اک جمود طاری ہے
آؤ انداز سوچ کے بدلیں

آج کل معتبر وہی ہیں جلالؔ
بھیس ہر روز جو نئے بدلیں

○

○

دل نہ بہلے گا لاکھ بہلاؤ
بھر سکیں گے نہ جان و دل کے گھاؤ

اب تو دنیائے خواب سے نکلو
اے مری جاں بلب تمناؤ!

مجھ کو نادم کرو خطاؤں پر
مجھ کو میرے ہی خوں میں نہلاؤ

نکہتِ گُل کا اعتبار نہیں
اپنی خوشبو سے خود کو مہکاؤ

ایک دل اور وسعتیں اتنی؟
ایک نقطہ اور اتنا پھیلاؤ

کہہ رہے ہیں یہ برگِ افتادہ
اے گُلو! شاخ پر نہ اِتراؤ

چھیڑ کر پھر حکایتِ ماضی
خود بھی تڑپو، مجھے بھی تڑپاؤ

○

○

ان سے مل کر بھی ملاقات نہیں ہو سکتی
ہونٹ ہلتے ہیں مگر بات نہیں ہو سکتی

آپ اگر اور ہمیں کچھ بھی نہیں دے سکتے
کیا تبسم کی بھی خیرات نہیں ہو سکتی

عظمتِ لوح و قلم کو نہ کریں وہ رسوا
جن سے اصلاحِ روایات نہیں ہو سکتی

کیوں نہ حالات سے اے دوست کریں سمجھوتہ
ختم جب یُورشِ صدمات نہیں ہو سکتی

جب تک اُلجھے گا خرد سے دلِ ناداں یارو!
ختم یہ کشمکشِ ذات نہیں ہو سکتی

طالبِ آب ہو کیوں دیکھ کے سیرابیٔ گُل
خشک کانٹوں پہ تو برسات نہیں ہو سکتی

ان کو تحقیق کی میزاں میں نہ جب تک تولیں
ہم سے تقلیدِ رسومات نہیں ہو سکتی

آج وہ مجھ سے ملے ہیں تو زباں چپ چپ ہے
جانے کیا بات ہے کیوں بات نہیں ہو سکتی

تحفۂ بیش بہا زیست اگر ہے تو جلالؔ
موت کیا یار کی سوغات نہیں ہو سکتی

ان سے مت پیار بڑھا کھیل نہ انگاروں سے
کر نہ سائے کی طلب ریت کی دیواروں سے

قہر آلود نگاہوں سے محبت چھلکی
مرہم آبلا ہے دو دھاری اُپی تلواروں سے

ختم ہو جاتا ہے آدھا تو اُسی وقت مرض
ہنس کے جب پوچھتے ہیں حال وہ بیماروں سے

روح پہلے ہی ندامت سے ہے چھلنی چھلنی
کر نہ اظہار حقارت کا گنہ گاروں سے

قولِ فیصل نہیں تقریرِ زبانِ شمشیر
دل کرد فتح بُراہین کے ہتھیاروں سے

عشقِ خوباں میں ملے گا نہ تجھے دل کا قرار
ڈھونڈ تسکیں نہ زر و سیم کے انباروں سے

اُترا اُترا سا ہے کیوں چہرہ یہ چپ چپ کیوں ہے
بات جو بھی ہے خدارا نہ چھپا یاروں سے

دُکھ نہ تڑپائیں تو سکھ کا ہو تصور کیسے
پھول کی ہوتی ہے پہچان سدا خاروں سے

اُنس ہے ہر رُخِ پُر داغ سے اتنا ہی جلالؔ
پیار جتنا ہے مجھے چمپئی رُخساروں سے

○

○

کشورِ گل پر خزاں کی حکمرانی ہائے ہائے
خاک میں ہے آج وہ الہڑ جوانی ہائے ہائے

کاش ہوتا علمِ تاثیرِ گنہ پیش از گنہ
یہ ندامت ہے عذابِ جاودانی ہائے ہائے

جس قدر میں نے کیا اظہار ایثار و خلوص
بڑھ گئی اتنی ہی اُس کی بدگمانی ہائے ہائے

خواہش دیدار کرتا ہوں تو ہر اک سمت سے
گونج اُٹھتی ہے صدائے لن ترانی ہائے ہائے

یہ ہوا کی سائیں سائیں یہ گھٹاؤں کا خرام
کیا قیامت ہے یہ شامِ ارغوانی ہائے ہائے

ڈوب جائیں گے ستارے قلزمِ ظلمات میں
پھر نہ لوٹے گی کبھی یہ شب سہانی ہائے ہائے

دکھ تو اس کا ہے کہ دانشور بھی صدیوں سے ہمیں
دے رہے ہیں دعوتِ سوزِ نہانی ہائے ہائے

جن لبوں سے پھول جھڑتے تھے کبھی ہنگامِ نطق
کر رہے ہیں آج وہ شعلہ فشانی ہائے ہائے

زلزلے منہ زور جذبوں کے، جب آئے اے جلالؔ
مٹ گئی شہرِ خرد کی ہر نشانی ہائے ہائے

○

○

موت تک اس زندگی کے ناز اٹھاتے جائیے
طفلِ دل جب تک نہ سو جائے اِسے بہلائیے

اب تو دامن بھی نہیں باقی جسے پھیلا سکوں
بھیک سے پہلے مجھے کاسہ عطا فرمائیے

تلخیٔ گفتار آخر چاہتوں کو ڈس گئی
میں نہ کہتا تھا کہ صاحب پیار سے سمجھائیے

خیر کی امید پہلے تھی نہ اب ہے آپ سے
بندہ پرور! اپنے ماضی پر نہ یوں شرمائیے

محفلِ دنیا میں شامل رہ کے بھی رہیے الگ
جھیل کی آغوش میں بن کر کنول لہرائیے

خوابِ رنگ و نور کو تعبیر بھی مل جائے گی
اس انا کے بند کمرے سے تو باہر آیئے

دوست بھی تو ڈس رہے ہیں بن کے مارِ آستیں
دشمنوں کی یورشِ پیہم سے مت گھبرایئے

زندگی محرومیوں کی جستجو کرنے لگے
آرزوؤں کو کچھ اس اعزاز سے دفنایئے

بلبلو! صیّاد ہے بیداد کا بھی داد خواہ
ہو خزاں بھی تو بہاروں کے ترانے گایئے

حسن و علم و فن وراثت میں کبھی ملتے نہیں
رنگ و نسل و ذات و دولت سے نہ دھوکا کھایئے

خار خار اس دشت کا صدیوں سے تشنہ کام ہے
دیکھ کر مقدور اپنا اشکِ خوں برسایئے

ہاں سرِ محفل ملامت بھی نصیحت ہی تو ہے
کیجے بدخواہی بھی، خیر اندیش بھی کہلایئے

اس دلِ محروم سے کیجئے حسیں وعدہ کوئی
لاش کو اک خوبصورت سا کفن پہنایئے

اور ابھی کچھ دن ملاقاتوں سے کیجئے اجتناب
آتشِ مہر و محبت اور ابھی بھڑکایئے

چھوٹ جائے جس سے دامانِ خیالِ یار بھی
دل کو اتنا حبِ نامہ بر میں مت الجھایئے

اپنے ہاتھوں سے قلم کیجے سرِ نخوت جلالؔ
اپنے کاندھوں پر صلیب اپنی اٹھا کر لایئے

پوچھ رہے ہیں رو رو کر اُجڑے گھر کے سناٹے
کون ہے جس نے دیمک بن کر پیار کے رشتے چاٹے

پا کر کھونا اور ہے پیارے، اور ہے کھو کر پانا
جس کو فوائد راس نہ آئیں مجھ سے لے لے گھاٹے

اب افسوس عبث ہے پہلے ہی کچھ سوچا ہوتا
جو آندھی کی فصلیں بوئے کیوں نہ بگولے کاٹے

تم سے بچھڑے تو یادوں نے حشر کیا اِک برپا
آوازیں خاموش ہوئیں تو چیخ اُٹھے سناٹے

ہے کمزور جلالؔ اہلِ خانہ کی بینائی بھی
اور ڈاکو بھی چہروں پر آئے ہیں باندھ کے ڈھاٹے

دل نئے غم سے آشنا نہ کرے
دن وہ آئے کبھی خدا نہ کرے

موت اگر مانگنے سے مل جائے
زندگی سے کوئی گلا نہ کرے

اس کے وعدوں پہ ہے یقیں مجھ کو
عمر شاید مِری وفا نہ کرے

فاصلے اور دل کے بڑھ جائیں
وقت ہم کو اگر جدا نہ کرے

چُور ہو جائے جس سے شیشۂ دل
اتنا احساس وہ عطا نہ کرے

برف کی ناؤ میں جو بیٹھا ہے
ناخداؤں پہ آسرا نہ کرے

بادِ صرصر جلالؔ تاک میں ہے
گُل سے سرگوشیاں صبا نہ کرے

○

○

چھوڑ اے دل! فرار کے حیلے
بن کے سقراط زہرِ غم پی لے

کیا توازن ہے کیا تناسب ہے
کانچ کے جسم، ذہن پتھریلے

وقت کی ضربتیں ارے توبہ
خواہشوں کے بدن ہوئے نیلے

عہدنامہ ابھی نہ کر منسوخ
ہیں ابھی تو حروف بھی گیلے

خونِ دل میں ڈبو کے اب شاید
آرزوؤں کے ہاتھ ہوں پیلے

رابطے کس طرح رہیں قائم؟
ہم کم آمیز ہیں وہ شرمیلے

ہے درِ دل جلالؔ کھلنے کو
کر مقفل نگاہ، لب سی لے

○

○

اے دل! نہ کر سیاہ اجالوں پہ تبصرے
مہنگے پڑیں گے وقت کی چالوں پہ تبصرے

ہمّت اگر ہے دل میں تو منجدھار میں اُتر
ساحل سے کر نہ ڈوبنے والوں پہ تبصرے

جو جی میں آئے لکھ مگر اتنا رہے خیال
اک روز ہوں گے تیرے حوالوں پہ تبصرے

جانے کب اہلِ بزم نوازیں جواب سے
جاری ابھی ہیں میرے سوالوں پہ تبصرے

وہ دے رہا ہے منزلِ نو کی بشارتیں
میں کر رہا ہوں پاؤں کے چھالوں پہ تبصرے

ماحول راس آ نہ سکا کیوں مجھے جلالؔ
اب کر رہا ہوں اپنے خیالوں پہ تبصرے

○

O

اظہار محال ہو گیا ہے
احساس وبال ہو گیا ہے

اب کچھ تو جواب دے زمانہ
ہر چہرہ سوال ہو گیا ہے

دل کی ہے اُڑان اب بھی جاری
گو بے پر و بال ہو گیا ہے

خوشیوں کو تلاش کرتے کرتے
دل وقفِ ملال ہو گیا ہے

ہر ایک جھپٹ رہا ہے جیسے
سُکھ لوٹ کا مال ہو گیا ہے

میرے تیری آنکھ میں ہیں آنسو
اے دوست! کمال ہو گیا ہے

محجوب نگاہ ہو گئی ہے
مستور جمال ہو گیا ہے

وارث کو تو خوں بہا ملا کچھ
خوں میرا حلال ہو گیا ہے

آزاد ہے روح قیدِ غم سے
جس دن سے وصال ہو گیا ہے

میرا دلِ زار؟ خیر چھوڑو
بس یوں ہی نڈھال ہو گیا ہے

صیّاد کا خوف کس لیے ہو
جب باغ ہی جال ہو گیا ہے

تنگ آ کے علاج سے مسیحا
مصروفِ قتال ہو گیا ہے

الفاظ کے پیرہن میں آ کر
مجروح خیال ہو گیا ہے

مستقبلِ زیست کے لیے کیوں
ابتر بُرا حال ہو گیا ہے

اپنے ہی خلاف دی گواہی
کیا تجھ کو جلالؔ ہو گیا ہے

بچھڑ کے بھی تیری یادوں کی رہگذر میں رہے
سفر کے بعد بھی ہم حالتِ سفر میں رہے

تعلّقات کا آغاز خوب ہے لیکن
تعلّقات کا انجام بھی نظر میں رہے

میں حق کی بات زباں پہ نہ جب تلک لایا
تمام لوگ مِرے حلقۂ اثر میں رہے

سلگ رہا تھا چمن اور دھواں دھواں تھی فضا
طیور پھر بھی مگر سایۂ شجر میں رہے

سیاہ خانۂ شب کے مکیں یہ چاہتے ہیں
کوئی نظارہ نہ جلوہ گہِ سحر میں رہے

نہ بار بار اداسی کا یوں سبب پوچھے
جو چند روز تُو آفات کے بھنور میں رہے

جہاں نہ پختہ ہو معیارِ زندگی کا شعور
وہاں تمیز بھلا خاک خیر و شر میں رہے

جب ان سے حال چھپایا تو اور فاش ہوا
عجب معاملے باہم دل و نظر میں رہے

چھلک پڑے نہ کہیں غم جلالؔ پلکوں سے
یہ گھر کی چیز ہے اچھا ہے اپنے گھر میں رہے

○

○

اتنا مسرور نہ ہو دیکھ کے سُندر چہرے
وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں اکثر چہرے

دم بخود رہ گیا سفّاک لٹیروں کا گروہ
گھر سے جب نکلے محافظ بھی چھپا کر چہرے

آج یادوں کے شفق رنگ دریچے مت کھول
ورنہ سونے نہیں دیں گے تجھے شب بھر چہرے

سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا سینے میں
جب کبھی اُبھرے ہیں یادوں کے اُفق پر چہرے

دل میں جب خواہشِ دیدار کے شعلے بھڑکے
کھا گیا وقت کا بے رحم سمندر چہرے

ہم نے بدلیں نہ کسی راہ پہ اپنی آنکھیں
گو وہ ملتے رہے ہر بار بدل کر چہرے

جانے کیا سوچ کے ہاتھ اس نے ستم سے کھینچا
خون میں تر ہونے لگے جب تہہِ خنجر چہرے

لوگ چُپ چُپ ہیں تو ہرگز انہیں بے حس نہ کہو
شِدّتِ غم سے بھی بن جاتے ہیں پتھر چہرے

اب بھی ماضی کو بھلانے میں ہوں مصروف جلالؔ
اب بھی ہیں میری تعاقب میں برابر چہرے

○

○

جب اُن سے حال سُنا سب ملال بھول گئے
ملا جواب کچھ ایسا سوال بھول گئے

ابھی تو قرض چکانا ہے ان کو مٹی کا
یہ بات کیوں مِری دھرتی کے لال بھول گئے

گلہ تمہی سے نہیں سب کا یہ وتیرہ ہے
ملا عروج تو دورِ زوال بھول گئے

عجیب بات کہ اوروں کے جو مسیحا تھے
خود اپنے زخم کا وہ اندمال بھول گئے

ہر اک نے اپنے مسائل کا حل تلاش کیا
مرا خیال، مِرے ہم خیال بھول گئے

ہوئی ہیں اب کے عجب بدحواسیاں طاری
شکار کرنے چلے اور جال بھول گئے

دکھا رہے ہو یہ کن پتھروں کو آئینہ
ارے جلالؔ زمانے کی چال بھول گئے

○

○

تمغۂ شہرت نہیں تو داغِ رسوائی ملے
کچھ تو اِن بے چین روحوں کو پذیرائی ملے

اے خدا! چھٹ جائے ذہنوں سے مسائل کا غبار
فکر کو تابندگی جذبوں کو رعنائی ملے

دشمنوں کا ذکر کیا وہ تو اُڑاتے ہیں ہنسی
اب کے غم خواروں میں بھی اکثر تماشائی ملے

رہبروں کی مصلحت بنی بنی ہے سنگِ راہ
کاش اب کوئی جنونی، کوئی سودائی ملے

پتّھروں سے خیر مقدم کر رہے تھے کل جو لوگ
آج وہ بھی ہم کو پھولوں کے تمنائی ملے

پیار کے دو بول وہ ہم کو عطا کر دیں اگر
ان شکستہ حوصلوں کو کچھ توانائی ملے

زندگی کی بانجھ دھرتی میں کھلیں خوشیوں کے پھول
حبس کے جلتے ہوئے صحرا میں پُروائی ملے

وادیٔ گُل کے مسافر اتنے تن آساں نہ ہوں
کچھ تو کانٹوں کو خراجِ آبلہ پائی ملے

لطف تو جب ہے کہ ہر منظر نظر افروز ہو
ہے مزا، جب دید کے قابل تماشائی ملے

یہ مسلسل بے قراری، مار ڈالے گی جلالؔ
ختم ہو جائیں مصائب یا شکیبائی ملے

جب بھی یاروں کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے
ہم نے سینے میں اترتے ہوئے خنجر دیکھے

ابر کی پیاس کے موضوع پہ تنقید بجا
آسماں سے وہ زمیں پر تو اتر کر دیکھے

آج بھی طُور پہ جلووں کا وہی عالم ہے
آنکھ میں تابِ نظارہ ہو تو منظر دیکھے

کون ہے جس کو نہیں رہزنِ غم نے لوٹا
ہم نے اس راہ میں سب لوگ برابر دیکھے

جن کے ہونٹوں سے کبھی پھول جھڑا کرتے تھے
ان کے لہجے سے برستے ہوئے پتھر دیکھے

اپنی توقیر کی خاطر تو پریشاں ہے مگر
اپنی تحریر کو بھی کاش سخنور دیکھے

اپنی ہی ذات میں کیسی یہ جلا وطنی تھی
گھر میں موجود تھے جو لوگ وہ بے گھر دیکھے

میرے مجبور تبسم سے بہلنے والا
کاش اک بار مری روح کے اندر دیکھے

وادیٔ ذات میں اُترے تو کئی راز کھلے
جو نہ دیکھے تھے کبھی ہم نے وہ منظر دیکھے

جانے کیا بات کہی تیز ہواؤں نے جلالؔ
ہم نے ہر شاخ پہ افسردہ گُلِ تر دیکھے

○

○

ہے معتبر مری ہستی ترے حوالے سے
ہو جیسے چاند کی پہچان اس کے ہالے سے

سنائیں حالِ دلِ زار کس طرح ہم لوگ
لگا دیئے ہیں غموں نے لبوں پہ تالے سے

اُبھر رہا ہے سرِ بامِ آرزو مہتاب
بکھر گئے ہیں نگاہوں میں پھر اُجالے سے

عجیب مرحلۂ انکشافِ ذات ہے یہ
کہ اپنے آپ کو پایا ترے حوالے سے

تو غم گسار ہے تو آج مجھ کو رونے دے
کہ دل سنبھلتا نہیں اب مرا، سنبھالے سے

کسی کو دار پہ چڑھ کر ملی بقائے دوام
ہوا ہے کوئی اَمَر زہر کے پیالے سے

نہیں ہے پیار تو نفرت کا ہی کرے اظہار
مجھے ملے تو سہی وہ کسی حوالے سے

جلال جدّتِ اُسلوب بھی ہے وصفِ غزل
مزا تو جب ہے مضامیں بھی ہوں نرالے سے

○

○

دل کرتا ہے یاد اسی کو رات گئے
جس کے ملنے کے سب امکانات گئے

اک چھوٹی سی بات پہ دوست ہوئے دشمن
اک پل میں برسوں کے احسانات گئے

اب کے کاسے تھام رکھے تھے سخیوں نے
جو سائل آئے دے کر خیرات گئے

اس دنیا نے خوب نوازا لوگوں کو
سب دل پر لے کر زخمِ صدمات گئے

سب اعزاز کے ساتھ اس بزم میں آئے تھے
سب اس بزم سے لے کر الزامات گئے

وہ روٹھا تو ہم سے جیون روٹھ گیا
اس کے ساتھ ہی خوشیوں کے لمحات گئے

جن لوگوں نے مجھ سے بولنا سیکھنا تھا
آج مجھے سمجھا میری اوقات گئے

جن میں تھا آباد جہانِ رنگ و بو
آج کہاں جانے وہ احساسات گئے

جب گھر میں شک کا آسیب ہوا داخل
ہر اک دل سے پیار بھرے جذبات گئے

بیتابی، غم، آہِ سوزاں، اشکِ رواں
ہم اس سے لے کر کیا کیا سوغات گئے

کوئی راہ نہیں جاتی سوئے منزل
کیسے موڑ پہ چھوڑ ہمیں حالات گئے

اشکِ ندامت نے ہی جلالؔ بھرم رکھا
نظروں سے گر کر جب اعزازات گئے

○

○

ختم ہونے میں نہیں آتے اضافی مسئلے
حل طلب حالانکہ ہیں پہلے ہی کافی مسئلے

میں نے اس امید پر کاٹی ہے قیدِ زندگی
موت آئے گی تو دے دیں گے معافی مسئلے

دیکھ لینا چاہتیں دم توڑ کر رہ جائیں گی
یوں ہی گر بڑھتے رہے یہ اختلافی مسئلے

زندگانی کی غزل کا شعر جب لکھا کوئی
بن گئے میرے لیے اکثر قوافی، مسئلے

گو مری ہر بات سے وہ کر رہے ہیں اتفاق
ہیں عیاں آنکھوں سے، دل کے انحرافی مسئلے

ہر خبر کی تہہ میں جنس و جرم کی ترغیب ہے
کر رہے ہیں حل بقولِ خود صحافی، مسئلے

تو نہ آیا تو نہیں پابند ہم بھی عہد کے
کر نہ دے پیدا تری وعدہ خلافی مسئلے

دُکھ نہ تڑپائیں تو سُکھ کی قدر و قیمت ہی نہ ہو
ہیں مریضِ زندگی کے حق میں شافی مسئلے

بات جو دل میں ہے کیوں لب پر نہیں لاتے جلالؔ
چھیڑتے کیوں ہو حقائق کے منافی مسئلے

کیوں حق کے ٹھیکیداروں میں سچائی کو رسوا کرتے
اُن میں سننے کی تاب نہ تھی اظہار حقیقت کیا کرتے

کُھل ہی جانا تھا بابِ عطا، بھر ہی جاتا کشکولِ طلب
کیوں خالی ہاتھ پلٹ آئے، کچھ دیر تو اور صدا کرتے

تم نے تو کوئی بات نہ کی ایسی بھی کیا مجبوری تھی؟
ہونٹوں پہ اگر پابندی تھی، آنکھوں سے لفظ ادا کرتے

کہتے ہیں طیور شکاری سے، ڈستی ہے باغ کی ویرانی
کرنا تھا ہم پر احساں تو پت جھڑ کے بعد رہا کرتے

بن سوچے دوست بنائے کیوں؟ اب پچھتانے سے کیا حاصل
جو اپنوں کو اپنا نہ سکے، غیروں سے خاک وفا کرتے

جن کو اظہار کے سانچے میں کوئی بھی جلالؔ نہ ڈھال سکا
کیسے ان احساسات کو ہم، لفظوں کا روپ عطا کرتے

جو پیہم آنسوؤں میں ڈھل رہا ہے
تمہاری آنکھ کا کاجل رہا ہے

مسافر کی کوئی ہمّت تو دیکھے
چلا جاتا نہیں اور چل رہا ہے

اسی کے ہاتھ میں ہے جامِ نفرت
وہی جو پیار کی چھاگل رہا ہے

ہماری آنکھ کی پتلی کا منظر
ہماری آنکھ سے اوجھل رہا ہے

سوا نیزے پہ بے شک آئے سورج
ہمارے سر پہ کب بادل رہا ہے

ہمیشہ دیدۂ اہلِ ہوس میں
گروہِ اہلِ دل پاگل رہا ہے

ہے چشمِ تر میں عکسِ حسرتِ دل
سمندر میں جزیرہ جل رہا ہے

اسے پائے حقارت سے نہ روندو
تمہارے سر کا یہ آنچل رہا ہے

جلاؔل اک دن ڈسے گا چاہتوں کو
جو شک کا سانپ دل میں پل رہا ہے

O

گر اپنے سر سے غموں کا بھاری عذاب اترے
کبھی نہ دیوارِ دل سے رنگِ شباب اترے

جدائی کرتی رہے گی پیدا نئے مسائل
ملو تو دریائے شوقِ خانہ خراب اترے

کبھی تو تاریک قید خانوں سے ہم بھی نکلیں
ہمارے آنگن میں بھی کبھی ماہتاب اترے

رفاقتوں کے سفر کی روداد کیا بتاؤں
نہ پوچھ قلب و نظر پہ کتنے عذاب اترے

اگر ہو واقف ہم اہل صحرا کی تشنگی سے
فلک سے روتا ہوا، زمیں پر سحاب اترے

حقیقتوں کا جمال تب آشکار ہو گا
سے جب خود فریبیوں کے نقاب اترے

تمہا دل میں اگر نہیں خواہشِ تغیر
تو کیا سے فرشتۂ انقلاب اترے

ہماری بے کے منظر بھی یاد رکھنا
کبھی جب آنکھوں اُ سُندر سا خواب اترے

○

وہ جس کی آسمانوں پر نظر ہے
خود اپنی ذات سے بھی بے خبر ہے

یقیناً شہسوار آئے گا کوئی
پریشاں پھر غبارِ رہگذر ہے

دلوں کے فاصلے سمٹے ہیں لیکن
ابھی درپیش صدیوں کا سفر ہے

میں کیا ہوں اور مری اوقات ہے کیا
فقط یہ آپ کا حسنِ نظر ہے

ہے جنباں عدل کی زنجیر لیکن
ابھی تک آہ محرومِ اثر ہے

جلاؔل اوجھل ہے جو میری نظر سے
اسی کا روپ مجھ میں جلوہ گر ہے

○

○

غم نصیبوں کو دیئے آ کر سہارے موت نے
ختم آخر کر دیئے دکھ درد سارے موت نے

کیسے کیسے مادرِ ایام نے بیٹے جنے
کیسے کیسے چاند قبروں میں اتارے موت نے

دل کی ہر اک حسرتِ ناکام کو پورا کیا
عمر کے کر کے مکمل گوشوارے موت نے

کربِ احساسِ فنا نے دل کی گرہیں کھول دیں
زیست کے الجھے ہوئے گیسو سنوارے موت نے

تیری دیوانے صلیبیں خود اٹھا کر لائے ہیں
جب بھی مقتل سے کیے ان کو اشارے موت نے

ذات کا غم ہے نہ اب حالات کا دکھ ہے جلاؔل
کر دیئے پورے سبھی ارماں ہمارے موت نے

○

آفات کے سیلاب میں اک لمحہ نہ ٹھہرے
آتے تھے نظر لوگ جو پاتال سے گہرے

اب مشورہ کوئی بھی سمجھ میں نہیں آتا
سوچوں پہ بٹھائے ہیں وہ حالات نے پہرے

بچ سکتا ہوں کیسے میں مکافاتِ عمل سے
جب خود میرے اندر ہیں عدالت کے کٹہرے

کیا شوقِ سفر راہنماؤں نے دیا ہے
منزل پہ بھی پُرجوش مسافر نہیں ٹھہرے

پہلے تو جلالؔ اُن کو خموشی سے گلا تھا
گویائی ملی مجھ کو تو وہ ہو گئے بہرے

یاد ہی میرے پاس رہنے دے
کچھ تو جینے کی آس رہنے دے

اتنا سیراب کر نہ جلووں سے
کچھ تو آنکھوں میں پیاس رہنے دے

آج مطرب خوشی کے گیت نہ گا
آج دل کو اُداس رہنے دے

دل کو احساس سے نہ کر عاری
پھول میں کچھ تو باس رہنے دے

بانٹ خوشیاں جلالؔ اوروں میں
اور غم اپنے پاس رہنے دے